اشفاق احمد کے افسانوں کی فکری مرکزیت.....محبت کا آفاقی رنگ

ڈاکٹر سفیر حیدر، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

Abstract

Ashfaq Ahmad is one of most prominant urdu short story. His short story is recognized by his interesting writing style and heart touching themes. In this article, it is discussed that, though he has written on multidymential aspects of life, but his chief and basic theme is universal colour of love.

اگر آج ہم سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں کو رومانوی دستاویز کے طور پر دیکھتے ہیں تو پریم چند نے ''کفن'' تک آتے آتے اُردو افسانے کو حقیقت نگاری کی معراج تک پہنچا دیا۔ سعادت حسن منٹو نے تہذیب کے ننگے پن کو ایک جراح کی سی با مقصد بے رحمی اور سفا کی کے ساتھ معاشرے کے سامنے رکھ دیا اور اسے دانستہ چولی پہنانے کی کوشش نہیں کی۔ کرشن چند نے مزدور کے آنسوؤں سے افسانے بُنے تو عصمت چغتائی نے چادر اور چار دیواری کے نام پر سُوں سُوں کرتے پریشر ککر سے ڈھکنا اُٹھایا اور جنسی و نفسیاتی الجھنوں کو بلند آہنگ لہجے میں افسانے کا موضوع بنایا۔ غلام عباس نے ''آنندی'' جیسے شاہکار افسانے تخلیق کر کے دھیمے لہجے میں شور مچا دیا۔ انتظار حسین، علامتی افسانے کے دبستان کے امام ٹھہرے اور خصوصاً ''آخری آدمی'' سے ''شہرزاد کے نام'' تک افسانوی مجموعے قاری کو چونکا کر رکھ دیتے ہیں۔ ممتاز مفتی نے افسانے کے اُڑن کھٹولے پر بیٹھ کر ذہنی الجھنوں کے مفت خواں طے کیے انور سجاد نے افسانے کا ایک دریچہ تجرید کی جانب کھولا اور افسانے کو پہیلی کے قریب کر دیا۔ اگر اُردو کے دیگر اہم افسانہ نگاروں کے ذکر کو اختصار کی خاطر چھوڑ دیا جائے تو مذکورہ تخلیق کاروں میں غلام عباس کے استثنیٰ کے ساتھ تقریباً سب کے یہاں اسلوب یا موضوع کے حوالے سے قاری کو چونکا دینے کی دانستہ کاوش نظر آتی ہے کوئی سلگتا ہوا، پرشور، نعرے جیسا خیال افسانے بنتا دکھائی دیتا ہے لیکن اشفاق احمد کے یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے اشفاق احمد زندگی کی نظر انداز حقیقتوں کو جن کے متعلق کسی نے کہا ہے کہ جس چیز کو ہم ہر وقت دیکھتے ہیں، اسے کبھی نہیں دیکھتے، موضوع بناتے ہیں۔ کوئی خون کی ہولی، جنسی اسکینڈل، کایا کلپ یا انقلاب ان کے افسانوں کی تخلیق کے لیے لازم محرک نہیں ٹھہرتا۔ بلکہ وہ ہلکے پھلکے انداز میں سانس لیتی زندگی سے جب چاہیں کوئی موضوع اُٹھا لیتے ہیں اور اسے ایک یادگار

افسانے کا روپ دے دیتے ہیں۔

ان کے یہاں عام لوگ معصوم بچے، پالتو جانور، بے بس بوڑھے، خاموش طبع محبت گزیدہ محنت زدہ مائیں اور بے آسرا عشاق (کچھ جنھاں تھیں بھارے) توجہ کا مرکز ٹھہرتے ہیں۔ اشفاق احمد اُجڑے ہوئے لوگوں سے گریزاں نہیں ہوتے اور حالات کی قبروں کے یہ خاموش کتبے ضرور پڑھتے ہیں وہ بطور نوجوان پروفیسر تو اٹلی کی ایلیٹ کلاس کی خوبرو دوشیزہ ''ماریا'' کے حضور اذن باریابی کو متاع حیات جانتے ہیں، لیکن بطور افسانہ نگار جب قلم اُٹھاتے ہیں تو اسی معاشرے کی استحصال زدہ لڑکی ''ایل ویرا'' کے نام سے افسانہ لکھ کر اس کے خشک آنسوؤں کا قرض اُتارتے ہیں ایک عام منشی ''ذات کا گڈریا'' منڈاسی کے گوالے کا بیٹا ''چتو'' (چنت رام) ان کے زندگی بھر کے لکھے افسانوں میں سب سے بڑا ہیرو بن کر سامنے آتا ہے۔ ''تنکہ'' کا سرور ''صفدر ٹھیلا''، ''گل ٹریا'' کا بھیا ''رات بیت رہی ہے'' میں پیڑ، ''بابا''، ''امی'' اور اسی افسانے میں مسعود۔ عام زندگی کے کردار ہیں۔ ''اماں سردار بیگم'' بھی ہر وقت سامنے رہنے والا اور کبھی نہ دِکھنے والا کردار ہے جسے اشفاق احمد کی ملامتی صوفی فکر نے اپنے حساس اور بینا قلم کے لمس سے کلاسیک کے درجے پر پہنچا دیا ہے یوں اشفاق احمد اُجڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی ڈھونڈتے ہیں اور انہیں یہ خزانے خرابوں میں مل بھی جاتے ہیں۔ کسی آثارِ قدیمہ کے ماہر ایسی لگن سے انسانی مزاج کے کھنڈرات میں دبے خزانے کا سراغ یوں لگاتے ہیں کہ فرد کے نہاں خانۂ باطن میں دبی، سہمی، خاموش گرد آلود نیکی کو ڈھونڈ لاتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں حُر آخری وقت میں ایک نئی بصیرت کے ساتھ یزیدی فوج کو چھوڑ کر لشکرِ حسین میں واپس آ جاتے ہیں۔ اشفاق احمد کے کرداروں کی شر سے خیر کی جانب یہ مراجعت ان کے انسانیت پر غیر متزلزل یقین کی مظہر ہے وہ ''لاتقنطو'' کے فلسفے کے پیروکار ہیں اور کبھی یاس کی تاریکیوں میں نہیں ڈوبتے۔ وہ صبح کے بھولے کے لیے شام تک دروازہ کھلا رکھتے ہیں اور جب وہ شام کو واپس آتا ہے تو اُسے طعنے اور جھڑکیاں نہیں ملتیں اور بھولا بھالا سمجھ کر معاف کر دیا جاتا ہے۔ ''امی'' میں جواری نوجوان مسعود واپسی کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔ اسی طرح ''ڈھور ڈنگر کی واپسی'' کا پہلا جملہ ہی یہ ہے ''ذرا دیکھئے انسان کی کایا کلپ کیسے ہوتی ہے'' اور یوں Nude تصویریں بنانے والی، روشن خیال، نائلہ اپنی داخلی قلبِ ماہیت کے بعد خدا کے حضور پورے اعتماد اور دعویٰ کے ساتھ کہتی ہے۔

> ''میں تو جوتھی، سوتھی، تو نے بھی مجھے یہ نہیں بتایا کہ کس نماز میں کتنی رکاتیں ہوتی ہیں اور کس میں کیا پڑھتے ہیں۔ پر اب میں نے بھی تیرا پیچھا نہیں چھوڑنا۔ اِلقول ڈاکٹر سعادت سعید یہ کہانی ''ایک تہذیب کی کایا کلپ کی تمنا'' سے معمور کہانی ہے۔''[۲]

افسانہ ''پناہیں'' میں اپنے بیٹے پر تشدد کرنے والے باپ کی بعد ازاں شفیق مدرس بننے کی آرزو بھی کفارے کی صورت میں ایک واپسی ہے۔

> ''ماسٹر جی! میں پڑھا لکھا مہاجر ہوں، مجھے اپنا ماتحت رکھ لیجئے ..... میں بچوں کو بالکل نہیں مارتا۔''[۳]

اسی طرح صفدر ٹھیلا جو پنڈت کی جان لینے پر تلا ہوتا ہے اسی کی خاطر اپنی جان پر کھیل جاتا ہے۔ مذکورہ تمام کرداروں میں باطنی انقلاب پورے جواز اور داخلی ارتقاء کے ساتھ بر پا ہوتا ہے اور ان کی فطرت سلیم کی یہ کروٹ قاری کے لیے نفسیاتی توجیحات کے ساتھ اس لیے قابل قبول ٹھہرتی ہے کہ اشفاق احمد کے یہ کردار ی عارضی اخلاقی تعطل اور بے اطمینان بے راہ روی کے اندھیروں سے نکل آتے ہیں کیونکہ ان کے یہاں اندرون ذات انسانیت سے خوابیدہ محبت انگڑائی لیتی ہے۔ اشفاق احمد کا پختہ یقین ہے کہ انسان کا خمیر محبت میں گوندھا گیا ہے۔

اشفاق احمد کے اکثر افسانوں میں ''ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی'' والا شکوہ بھی ملتا ہے۔ انسانی مقدر کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔ عشقِ ناتمام کی کسک اور ماتمِ یک شہرِ آرزو کی صدائیں ہوش اُڑا دیتی ہیں۔ ایسے افسانے دردِلا دوا کا منظر نامہ ہیں۔ کافکا نے اپنی محبوبہ مالینا کے نام اپنے خطوں کو لکھے ہوئے بوسے قرار دیا تھا۔ ڈاکٹر سعادت سعید کے الفاظ میں: ''اشفاق احمد کے افسانے لکھے ہوئے آنسو ہیں'' یہ بیان افسانوی مجموعہ ''اجلے پھول'' کے تناظر میں خاص معنویت کا حامل ہے۔ داؤ جی (گڈریا)، مسعود (امی)، ثریا (برکھا)، بھیا (گل ٹریا)، آپی (اجلے پھول) ''توشے بلّے'' میں بے اولاد لڑکی، شازیہ (شازیہ کی واپسی) سب کردار پکار پکار کر کہہ رہے ہیں'' جو چاہے سو آپ کرے ہیں.....''

''توشے بلّے کی مجھے ضرورت تھی، مادرِ فطرت کو نہ تھی۔''[۴]

''ابھی کار چلے گی اور بھیا کے پاس ایک ڈائری رہ جائے گی جیسے ٹی ٹی کے گُم ہو جانے پر ہمارے پاس زنجیر رہ گئی تھی۔''[۵]

''تنکہ'' میں سرور کی بے بسی دکھانے کے لیے شیلے کی نظم کی چند سطروں سے نشتر کا کام لیا گیا ہے۔

''مجھے اُٹھاؤ۔

ایک لہر کی طرح، ایک پتّے کی طرح، ایک بدلی کی طرح میں زندگی کے خارزار میں گر گیا ہوں اور میرا خون بہہ رہا ہے۔''[۶]

''گڈریا'' میں دلگداز منظر ملاحظہ کیجیے اور پھر میر کا شکوہ یاد کیجیے:

''رانو کی قیادت میں اس کے دوست داؤ جی کو گھیرے کھڑے تھے اور رانو، داؤ جی کی ٹھوڑی پکڑ کر ہلا رہا تھا ''اب بول بیٹا، اب بول'' اور داؤ جی خاموش کھڑے تھے ایک لڑکے نے اُن کی پگڑی اُتار کر کہا ''پہلے بودی کاٹو بودی'' اور رانو نے مسواکیں کاٹنے والی درانتی سے داؤ جی کی بودی کاٹ دی، وہی لڑکا پھر بولا ''بلا دیں جے'' اور رانو نے کہا ''جانے دو بڈھا ہے'' میرے ساتھ بکریاں چرایا کرے گا'' پھر اس نے داؤ جی کی ٹھوڑی اُوپر اُٹھاتے ہوئے کہا ''کلمہ پڑھ پنڈتا'' اور داؤ جی آہستہ آہستہ بولے:

''کونسا؟''

رانو نے اُن کے ننگے سر پر ایسا تھپڑ مارا کہ وہ گرتے گرتے بچے اور بولا ''سالے کلمے بھی کوئی پانچ سات ہیں۔''

جب وہ کلمہ پڑھ چکے تو رانو نے اپنی لاٹھی اُن کے ہاتھ میں تھما کر کہا ''چل بکریاں تیری انتظاری کرتی ہیں۔''[۷]

عشق ناتمام کی کسک اشفاق احمد کے افسانوں میں گہری نقش گری کرتی ہے اور قاری اس درد کو پورے قرب کرب کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ اکثر لوگ محبت کے سٹیشن پر پہنچتے تو ہیں لیکن گاڑی پر سوار نہیں ہو سکتے ایک ایک کر کے تمام ڈبے مسافر سمیٹ کر گزر جاتے ہیں اور وہ بے حس و حرکت کھڑے رہتے ہیں، ہاتھ تک نہیں ہلا سکتے اور سٹیشن یوں خالی ہو جاتے ہیں جیسے لڑائی کے بعد کچی بارکیں۔ لاحاصلی کی دہلیز پر بیٹھے یہ کردار ایک ہی جذبے کی پہیلی بوجھنے میں خود پہیلی بنتے جاتے ہیں۔ محبت اور محبت کے ساتھ جُڑے مقدرات جو بسا اوقات فہم انسانی سے ماوراء ہیں۔ بقول خواجہ غلام فرید ''بکیاں بکیاں نی وے''۔

''اگلے دن صبح ہی صبح میں اور آپی چوکیدار کے ساتھ قبرستان گئیں اور ہم دونوں نے کلیوں کی وہ چادر جو چاندنی کی کرنوں تلے بیٹھ کر گوندھی تھی انجم بھائی کی قبر پر ڈال دی۔''[۸]

''ایک لڑکی نے روتے ہوئے کہا ''مس دونوں بچے جل کر راکھ ہو گئے۔''

مس نے بڑے تحمل کے ساتھ بڑی ملائم آواز میں کہا۔

''ہاں کلثوم، دونوں زرناب گل ہو گئے''[۹]

''یہ اکثر کہا کرتی تھی کہ جب تم وردی پہن کر میرے ساتھ پرنسٹن کی گلیوں میں چلو گے تو ہر بڑی اور بحری فوجی ہمیں سلام کیا کرے گا، کاش اُس کی یہ آرزو پوری ہو سکتی'' شام کو ہم نے پیڑ کو اُس کے جلے ہوئے جہاز میں ڈال دیا۔''[۱۰] ''اُجلے پھول'' میں خصوصاً دبا دبا سا یہ پیغام بھی ہے کہ انسان کو ''بڑی بات'' کہتے ہوئے اپنے ''چھوٹے منہ'' کا ضرور خیال رکھنا چاہیے اور ہر حال میں بڑے بول بولنے سے گریز لازم ہے کیونکہ قیمت چُکانا پڑے تو زندگی مشکلوں میں پڑ جاتی ہے۔ ''اُجلے پھول'' میں کیپٹن انجم کے چند جملے اور بعد ازاں انجام کسی انتباہ کا استعارہ ہیں۔

''انسان زندانیٔ تقدیر نہیں، بلکہ تقدیرِ یزداں ہے اور قسمت، تقدیر، مقدّر سب بے معنی چیزیں اور بیہودہ خیال ہیں۔'' ''اب میں فولاد کی طرح مضبوط ہو گیا ہوں یوں لگتا ہے کہ زندگی اور موت دونوں میرے قبضے میں آ گئی ہیں۔'' ''میں ایک دن تمہیں لینے آؤں گا، خواہ میری راہ میں جہنّم ہی کیوں نہ حائل ہو جائے۔''[۱۱]

جہنّم تو کُجا، ایک اینٹوں سے بھرے ہوئے ٹرک سے بچنا کیپٹن انجم کے لیے ممکن نہیں رہتا اور وہ اپنے خوابوں سمیت کُچلا جاتا ہے۔

اشفاق احمد کے یہاں مرکزی جذبہ محبت ہے اور اس کے مختلف روپ ہیں جو سوا فسانوں کو جنم دیتے ہیں۔ اس پختہ یقین کا اعادہ بار بار ہوتا ہے کہ محبت ہی وہ اسمِ اعظم ہے جو انسان پر ذات اور کائنات کے بند دروازے کھول

سکتا ہے اور ''جو بھی کچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے۔''

''میں نے کہا: ماسٹر صاحب انجیل میں لکھا ہے اگر میں سارے جہان کی بولیاں بولوں اور تمام دُنیا کے علم حاصل کر لوں لیکن محبت نہ کروں تو میں ٹھنٹھنا تا ہوا پیتل اور جھنجھناتی ہوئی جھانجھ ہوں۔''[۱۲]

محبت کا یہی جذبہ ان کے کرداروں کو ہر قسم کے تعصب کی آلائشوں سے پاک رکھتا ہے۔ ''گڈریا'' کا داؤ جی اُس محبت کا (جو بے تعصّب دل میں جنم لیتی ہے) کلائمکس ہے۔ ''بابا'' کی ایلن، ''شب خون'' کی بٹیرس اور سنگدل، میں پمّی اسی طرح کے وسیع القلب کردار ہیں۔ جہاں رنگ، نسل، مذہب اور جغرافیائی جُوت، جذبۂ محبت کی آفاقیت کے آگے سرنگوں دکھائی دیتے ہیں۔

اشفاق احمد کے یہاں افسانے میں ایک محبت کا دریچہ معصوم بچوں اور پالتو جانوروں کے لیے وقف ہے۔ گا تو فہیم، شب خون، گل ٹریا اور تلاش، ایسے افسانوں میں اس بات کی طرف اشارے ملتے ہیں کہ بچوں کی آوازوں کو اس طرح دبا دیا جاتا ہے جیسے ظالم فوجی آمر کے عہد میں بے بس رعایا کی آہ و بکا۔

دلکش اسلوب، فکری وفنی پختگی، معاشرتی بصیرت، مابعد الطبیعاتی رجحانِ طبع، فرد کی نفسیاتی الجھنوں کی غواصی، اشفاق احمد کے افسانوں کے امتیازی اوصاف ہیں لیکن کہانی اور فن کی ان تمام لہروں کا مرکزی فکری سرچشمہ محبت کا آفاقی جذبہ ہے۔

حواشی:

۱۔ اشفاق احمد، صبحانے فسانے، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)، ص: ۸۳

۲۔ راوی، ۲۰۰۵ء، جی سی یونیورسٹی، لاہور، ص: ۵۹

۳۔ اشفاق احمد، ایك محبت سو افسانے، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء)، ص: ۳۵

۴۔ اشفاق احمد، اجلے پھول، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص: ۴۵

۵۔ ایضاً، ص: ۵۲

۶۔ ایضاً، ص: ۱۱۳

۷۔ ایضاً، ص: ۲۱

۸۔ ایضاً، ص: ۹

۹۔ ایضاً، ص: ۷۱

۱۰۔ اشفاق احمد، ایك محبت سو افسانے، ص: ۲۷

۱۱۔ اشفاق احمد، اجلے پھول، ص: ۷۔۱۰۔۱۱

۱۲۔ اشفاق احمد، ایك محبت سو افسانے، ص: ۴۴

مآخذ:

۱۔ اشفاق احمد،اجلے پھول،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء۔

۲۔ اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء۔

۳۔ اشفاق احمد،سفرِ مینا،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء۔

۴۔ اشفاق احمد،صبحانے فسانے،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۵ء۔

۵۔ راوی،۲۰۰۵ء،،جی سی یونیورسٹی،لاہور

۶۔ سعادت سعید،ڈاکٹر،جہت نمائی،لاہور:دستاویز،۱۹۹۵ء۔

☆☆☆